پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانی گولڑوی کا رنگِ غزل

ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ

Dr. Muhammad Shah Khagga

Department of Persian,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Peer Syed Ghulam Moin was born in a well renowned, famous, and distinguished family of mystics (Sufis) and poets. Therefore growing up, not only he became well familiar with mysteries and codes of mysticism but also poetry. Moreover, the study of the poetry of his grand father Peer Mehar Ali Shah Gillani, Molana Jami, Molana Romi, Hafiz Sherazi, Ameer Khusro, Abdul Qadir Bedil, Ameer Meenai and Momin Khan Momin etc., added flavour to his poetry. His Ghazal is a blend of different topics of physics and metaphysics and his variety of topics, shows his positive behaviour toward life. This research article is an analysis of the variety and components of his poetry.

صنف غزل میں اور ادب کے ابتدائی دور میں عاشقانہ اور رندانہ مضامین عام طور پر پیش کئے گئے ہیں۔غزل میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں ہی ملتے ہیں۔متقدمین شُعرا نے اس کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کی ہے،عہدِ حاضر میں بھی اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ جس شعر میں تغزل نہ ہو وہ غزل کا شعر نہیں ہوسکتا لیکن عام طور پر شعرائے دورِ جدید اس کے پابند نہیں ہیں۔اب غزل میں سیاسیات،اقتصادیات،مذہب، فلسفہء اخلاق،وعظ ونصیحت کے علاوہ طرح طرح کے مضامین کو جگہ دی جانے لگی ہے۔غزل کا دائرہ عہدِ حاضر میں وسیع ضرور ہوگیا ہے۔مگر اس کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی وجہ سے غزل گو شعرا کی تعداد میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔اس کے مقابلے میں دیگر اصنافِ سخن مثلاً نظم زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔عصرِ حاضر کے شعرا کی مصروف زندگی اُنہیں اِس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ غزل کے اشعار اپنے قلبی واردات سے مجبور ہو کر پیش کریں۔اُن کے اشعار آمد کی بجائے آورد کا نتیجہ ہوتے ہیں کیوں کہ اُنہیں وہ سکون، وہ عیش اور خوش وقتی کا وہ دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا جو شُعرائے متقدمین متوسطین اور متاخرین کا دور تھا اور جس دور میں انہوں نے اپنی زندگی کے دن گزار کر غزل کی پرورش کی تھی۔

پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانی گولڑویؒ متخلّص بہ مشتاقؔ اُردو زبان کے بڑے پختہ شاعر تھے۔انھوں نے غزل میں اچھوتے اور منفرد مضامین پیش کیے ہیں،صنفِ غزل کے علاوہ حمد،نعت اور مناقبِ اولیاء پر بھی بڑی لطیف طبع آزمائی کی ہے۔وہ

خوبصورت شخصیت اور جاہ وجلال کے مالک تھے۔آپ کی طبیعت مترنم اور غزل کا سا مزاج تھا، درد وہجر اور شاعرانہ کمالات تو آپ کو ورثہ میں ملے تھے،آپ کے دادا قبلہ پیر سیّد مہر علی شاہ گیلانیؒ فارسی، اُردو اور پنجابی کے شاعر تھے۔آپ کے بڑے صاحبزادے پیر سیّد نصیر الدّین نصیرؔ گیلانیؒ عربی، فارسی، پنجابی اور اُردو زبان کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔آپ کے پوتے اور درگاہ گولڑہ شریف کے سجّادہ نشین پیر سیّد غلام نظام الدّین گیلانی قادری معروف بہ جامیؔ گیلانی صنفِ غزل اور رُباعی کے بڑے جاندار شاعر ہیں۔موروثی شاعرانہ صلاحیت اور کمالات کا ذکر پیر سیّد نصیر الدّین نصیرؔ گیلانیؒ نے ایک جگہ پر کچھ اس طرح سے کیا ہے: مجھے ذوقِ علم وادب ورثے میں مِلا۔پردادا حضرت پیر مہر علی شاہ قدّس سرّہٗ، جدِّ امجد سیّد غلام محی الدّین المعروف بابو جی رحمۃ اللہ علیہ اور والدِ ماجد قبلہ سیّد غلام معین الدّین صاحبؒ متخلّص مشتاقؔ کا شعر وسخن سے لگاؤ باخبر احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔اِس موروثی فیض کے علاوہ بھی یہ سمجھتا ہوں کہ بزرگانِ اُمّت اور اساتذۂ سخن مولانا رومیؒ، مولانا جامیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، حضرت سعدی شیرازیؒ، طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ اور میرزا عبدالقادر بیدلؒ ایسے نابغہء روزگار نفوس کے کلام نے میرے توسنِ فکر کے لیے مہمیز کا کام کیا۔اگرچہ اِن اکابرِ اُمّت کے علوِّ فکر اور عفتِ خیال کا جہان ہی کچھ اور ہے۔(۱)

پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانیؒ کے مجموعۂ شاعری اَسرار المشتاقؔ میں غزل کا رنگ اصغر گونڈوی، امیر مینائی اور مومنؔ جیسا ہے لیکن کہیں کہیں استاد داغؔ کی جھلک بھی ملتی ہے۔غزل کی شاعری چونکہ کیفیات اور احساسات کی شاعری ہے۔غزل میں مَے وساغر، زلف ورخسار اور قد وقامت سب استعارے ہیں۔ایک صوفی شاعر بھی صنفِ غزل میں یہی استعارے بڑے شان و شوکت اور تمکنت کے ساتھ استعمال کرتا ہے:

آخر ان کے گیسوئے پُر پیچ میں دل پھنس گیا
خود سرے پن کا زمانے میں یہی انجام ہے
چھوڑ کر زلفیں رُخِ روشن پہ جب وہ سو گئے
میں نے سمجھا صبح ناکامی کی پہلی شام ہے(۲)

دبستان دہلی کا مزاج ہجر وفراق، حزن وملال، بے وفائی ویاسیت اور محبوب کی بے نیازی ہے۔فرقت کے لمحات کو من وعن بیان کر دینا، ان کی اوّلین مجبوری یا ان کا اوّلین مقصد ہے۔دہلی کے شاعر کی زندگی کا مقصد اور غایت عشق ہی ہے ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا معشوق مرد ہے۔امرد پرستی بھی صوفیانہ خیالات کے باعث قائم ہوئی۔صوفیانہ عقاید کے مطابق عشقِ الٰہی ان کا منتہائے نظر ہوتا ہے۔اَسرار المشتاق کی بیشتر غزلیں حزن وملال اور ہجر وفراق کا مضمون لیے ہوئے ہیں، سیّد غلام معین الدین گیلانیؒ چونکہ صوفی بزرگ تھے، ان کا عشق یقیناً عشقِ حقیقی ہے اور ہجر کا انداز ملاحظہ ہو :

فرقت کے جو صدمے سہتے ہیں خاموش پریشاں رہتے ہیں
سُنتے ہیں نہ وہ کچھ کہتے ہیں اک آگ میں جلتے رہتے ہیں
ہر روز تماشا ہوتا ہے دل خون کے آنسو روتا ہے
اِک یاد تمہاری ایسی ہے ہم جس سے زندہ رہتے ہیں
کیوں آنا جانا چھوڑ دیا کیوں مکھڑا ہم سے موڑ لیا
کیوں عہدِ وفا کو توڑ دیا کیا رسمِ وفا اسے کہتے ہیں(۳)

صوفی شاعر حقیقت میں پُر امید ہوتے ہیں لیکن عشق کی اپنی کیفیت ہوتی ہے، عشقِ حقیقی میں وصالِ محبوب کے لیے تڑپنے کا بھی اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ہجر و فراق کے لمحات چونکہ طویل ہوتے ہیں اس لیے انتظار بڑا مشکل اور کٹھن ہوتا ہے پھر پُر امیدی کے ساتھ ساتھ نا اُمیدی اور مایوسی بھی موضوعِ سخن اور شعر کا حسن بن جاتی ہے۔ مشتاقؔ کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

او صنم ترے نہ آنے کی قسم کھاتا ہوں میں
اس دل بیتاب کو دن رات سمجھاتا ہوں میں
کیسی آنکھیں پھیر لیں انجان کیسے بن گئے
دیکھ کر ان کی طرف حیران ہو جاتا ہوں میں
خوب ہی اچھا کہا مشتاقؔ جس نے یہ کہا
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں(۴)

ایک بڑے دل والے عاشق کا شیوہ اپنے محبوب کو دعائیں دینا ہے۔ وہ جتنا بھی تڑپائے اور ستائے، اعلیٰ ظرفی کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے پھر بھی دعا دی جائے اور دردمند عاشق اپنے بے وفا محبوب کو خوش و خرّم ہی دیکھنا چاہتا ہے، مشتاقؔ بھی محبوب کو دعائیں دیتے ہیں:

تم شاد رہو آباد رہو ، ہر حال میں تم خوش حال رہو!
اس حال میں ہم کو رہنے دو، جس حال میں ہم اب رہتے ہیں(۵)

اُردو شعرا نے فارسی غزل سے مضامین لیے اور ہر زمانے میں شعرا نے غزل میں وہی موضوعات پیش کیے جو پہلے استعمال ہو چکے تھے یعنی روحانی گہرائی ، وارداتِ قلبیہ ، تصوّف ، عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، معاملہ بندی، مضمون بندی، خیال بندی، تمثیل، نازک خیالی، رعایتِ لفظی، فارسی تراکیب، تشبیہات و استعارات کی غرابت، عُلوِ خیال اور غُلوِ خیال ہر ایک چیز برتی جا چکی تھی، گل و بلبل کی داستانیں، شمع و پروانے کے قصّے، لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں، جفائے ناز ، رشکِ اغیار، شوقِ وصل، رنجِ فراق، زلفِ پریشاں، نرگسِ بیمار، سیبِ زنخداں، رندی بادہ خواری، زاہدوں پر طعن و تشنیع، غرض کہ مضامین کی ہر صورت سے ضرب و تقسیم کی جا چکی تھی۔ اب ایک شعری انقلاب کی ضرورت تھی، اور وہ نظم بلکہ آزاد نظم کی صورت میں بر پا ہوا، ناقدینِ ادب نے کہا کہ غزل اور پھر وہی فرسودہ مضامین، ان سے دل بھر گیا تھا لہٰذا نئے مضامین شعرا کو پیش کیے جانے چاہییں لہٰذا اس دورِ جدید میں بھی شعرا نے غزل پر طبع آزمائی کرنا نہیں چھوڑا۔ پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانی گولڑوی ؒ نے غزل میں وہی اساتذہ سخن والے مضامین پیش کیے ہیں اگرچہ آپ کا زمانہ ماضی قریب ہے یعنی مارچ ۱۹۹۷ء میں اس جہانِ فانی سے عالم بقا کا سفر طے کیا ہے۔ لیکن غزل کے مضامین میں وہی ہجر و فراق، حزن و ملال، آہیں اور آنسو بہانے والے مضامین استعمال کیے ہیں۔ اصل میں انسان کی معراج درد و کرب ہی میں ہے۔ ہجر و فراق سے ہی تو انسان کاملیت کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ عشق ایک پاکیزہ اور ارفع جذبہ ہے، علاّمہ مُحمّد اقبال نے بھی اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے:

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست(۶)

پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانی ؒ تو عاشقِ صادق تھے۔ بلکہ آپ کا تو تخلص بھی مشتاقؔ ہے جس کا مطلب ہی عاشق ہے:

عاشق ومعشوق وعشق وشوق سے مشتق ہے یہ
واہ اے مشتاقؔ کیا پیارا تمہارا نام ہے(۷)

اسی لیے تو مشتاقؔ برملا فرماتے ہیں:

غمِ فرقت میں مرجانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا
مزا الفت کا یوں پانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا(۸)

غلام محی الدین گیلانی گولڑوی کا شعری آہنگ واضح، سادگی سے مزین ثقالت سے مبرا ہے۔ اپنی فرقت کے لمحات، محبوب کے اشعار میں چھلکتے آنسوؤں کی تصویر خوب الفاظ سے سجاتے ہیں:

تیری فرقت میں کوئی مرتا ہے
رات دن تیری راہ تکتا ہے
یاد جس وقت تیری آتی ہے
اشک بہتے ہیں دل دھڑکتا ہے(۹)

مشتاق کے ہاں فرقت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے صدمات نہایت جگر کاوی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ فرقت اور انتظار ان کے خاص استعارے ہیں جن کی مدد سے وہ محبوب سے ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں:

تری فرقت میں اب جینا گراں ہے اس قدر مجھ کو
کہ مرنے کی دوا دیتے ہیں میرے چارہ گر مجھ کو
کسی کی جستجو میں آپ ہی میں کھو گیا ایسا
کہ اب مشتاقؔ مدت سے نہیں اپنی خبر مجھ کو(۱۰)

درد وغم، رنج والم، ہجر وفراق اور حسرت ویاس بھی ان کی غزل کے خاص موضوعات ہیں:

دردِ فرقت ، داغِ حسرت ، سوزِ غم رشکِ رقیب
اِک دل ناشاد میں کیا کیا ہے پنہاں دیکھئے(۱۱)

ایک دوسری غزل میں کچھ اس طرح ہے:

تیری فرقت میں مجھ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکتا
کبھی رونا ، کبھی ہنسنا ، کبھی فریاد ہوتی ہے
نہ مرنے کی اجازت ہے نہ قدموں میں بلاتے ہیں
عجب انداز سے مشتاقؔ پر بیداد ہوتی ہے(۱۲)

پیر سیّد غلام معین الدّین گیلانی گولڑوی ؒ کی آنکھوں میں ایک عجیب سحر تھا، جو بھی آپ کی آنکھوں کی زد میں آجاتا، وہ چشم پُرفتن کا اسیر ہو جاتا یعنی بچ نہ سکتا۔ لیکن یہ حسین وجمیل شہزادۂ غوث الوریٰ اپنے والدِ گرامی قبلہ پیر سیّد غلام محی الدّین بابو جی ؒ کا عاشق تھا، اُن کے عشق میں اپنے آپ سے بیگانہ تھا، صبح ومسا قبلہ بابو جیؒ کی محفل چاہتے، قربت و وصال کی جستجو کرتے، ان کے قول وفعل کو اپنانے کی کوشش کرتے، حتیٰ کہ محبوب کی یاد میں، وصل کی آرزو میں شعر کہتے کہتے حقیقت میں مشتاقؔ بن گئے:

آرزوئے وصلِ جاناں میں سحر ہونے لگی
زندگی مانندِ شمع مختصر ہونے لگی
جب چلا مشتاقؔ اپنا کارواں سوئے عدم
یاس ہم آغوش ہو کر ہم سفر ہونے لگی(۱۳)

شبِ ہجر کی تلخیاں ہوں، وفورِ غم کے چرکے سہنے کی عادت ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ حسرت و یاس کے ساتھ محبوب کی تنگ نظری اور اپنی کشادہ دلی کا بیان کرتے ہیں:

شبِ ہجر کی تلخیاں کچھ نہ پوچھو!
نہیں داستاں یہ سنانے کے قابل
وفورِ غم یاس نے ایسا گھیرا
نہ چھوڑا کہیں آنے جانے کے قابل(۱۴)

شبِ فراق میں نالۂ درد کا بیان بھی مشتاق صاحب کی غزل کی زینت بنتا ہے۔ وہ کم آمیزی سے نفرت اور درد آمیزی سے گزرے دنوں کو یاد کر کے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں:

ہمدم نہ پوچھ میری محبت کی انتہا
یہ وہ شبِ فراق ہے جس کی سحر نہیں
مدت سے ہم ہیں جس کی محبت میں مبتلا
اس کا یہ حال ہے کہ اسے کچھ خبر نہیں(۱۵)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی توجہ کے زندگی بھر طلب گار رہتے ہیں۔ معاملہ بندی بھی ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ جیسے وہ اپنے محبوب سے باتیں کر رہے ہوں:

مری رودادِ غم سن کر وہ بولے
مزا ملتا ہے تیری داستاں سے
یاد جس وقت تیری آتی ہے
اشک بہتے ہیں دل دھڑکتا ہے(۱۶)

عشق ایک آگ ہے اور اس کی انتہا میں یقیناً خود سے بے خود اور بے گانہ ہو جاتا ہے، کسی کے بس میں نہیں ہے بلکہ یہی ایک عاشق کی معراج ہے:

سب کچھ بھلا چکا ہوں محبت میں آپ کی
اک یاد رہ گئی ہے دل بے قرار میں(۱۷)

جب جامعہ عباسیہ بہاول پور میں تحصیلِ علم کے لیے رہے تو دونوں جانب یہ کسک رہی کہ جلد از جلد وصال ہو، ملاقات ہو، اس ہجر و فراق میں تڑپنے اور سسکنے کی دلیل مکتوباتِ مسافر چند روزہ ہے جس میں ہر مکتوب ثابت کرتا ہے کہ شدتِ عشق کیا چاہتا ہے، یعنی اس شدت نے تمام راز آشکار کر دیئے ہیں اسی لیے فیضیؔ دکنی نے کہا تھا:

ما اگر مکتوب ننوشتیم عیب ما مکن
درمیان راز مشتاقان قلم نا محرم است(۱۸)

عشق میں تو کچھ ہوش نہیں رہتا، بلکہ ایک پل میں حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے، عاشق کو زمانے کی کچھ پروا نہیں رہتی، پھر دیوانگی میں اپنی آشفتہ سری کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ مشتاقؔ کی حالت دیکھیں کیا ہوگئی ہے:

کیا سے کیا دو دن میں حالت ہو گئی
دل نہ آیا اک قیامت ہو گئی
آپ تو مشتاقؔ کا چھوڑیں نہ ساتھ
ہو گئی دنیا کو نفرت ہو گئی(۱۹)

ایسی حالت میں جب محبوب داغِ مفارقت دے جائے تو عاشق کے لیے رستخیز ناگہاں کی سی صورت پیدا ہو ہو جاتی ہے یعنی اپنے باپ قبلہ پیر سیّد غلام محی الدّین معروف بہ بابو جیؒ کے انتقال پر یہ سرو قامت عاشق مرجھا گیا اور ہمہ وقت اپنے سینے میں اس کی یاد لیے تڑپتا رہا، روتا رہا۔ احباب اور نیاز مند کہنے لگے کہ اب وہ شباب نہ رہا ہے، ان کی فرقت میں ڈھل گئے، اور اکثر کہتے تھے:

دل تڑپتا رہ گیا اک مرغ بسمل کی طرح
وہ ادا و ناز سے خنجر چلا کر چل دیئے(۲۰)

کسی وقت یہ کیفیت رہی:

کوئی مشتاقؔ ان سے پوچھ کر اتنا ہی بتلا دے
وہ کس سے پیار کرتے ہیں کسے اپنا سمجھتے ہیں(۲۱)

ایک صوفی عاشق، ایک صوفی معشوق کے عشق میں اسی طرح تڑپتا ہے اور اسی طرح اپنے عشق اور درد و فراق کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ روٹھ جاتا ہے تو اس دنیا سے ہی چلا جاتا ہے۔ جب محبوب ہی اس جہاں سے چلا جائے تو پھر یہ جہان اچھا نہیں لگتا، اور یہ اٹل حقیقت ہے، عاشق جتنا بھی پُر امید ہو وہ مایوس ہو جاتا ہے:

قسمت بھی ہم سے روٹھ گئی اور وہ بھی ہم سے چھوٹ گئے
اِک آس تھی وہ بھی ٹوٹ گئی اب جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
مشتاقؔ نہ ہو مایوس ذرا اِک دن وہ ترا ہو جائے گا
یہ دنیا ہے اس دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں(۲۲)

باپ چونکہ معشوق اصلی تھا، اس کے دنیا سے چلے جانے سے مشتاقؔ شب و روز روتا اور آہیں بھرتا رہتا تھا، اس لیے مایوسیوں کے بادلوں نے ہر طرف سے گھیر لیا:

اب نہ حسرت ہے نہ کوئی آرزو
دل کے ٹکڑے کر کے وہ جانے لگا
دیکھ کر مشتاقؔ ان کی بے رخی
گلشنِ امید مرجھانے لگا(۲۳)

اس کا وعدہ آج تک وعدے کا وعدہ ہی رہا
اک نہ اک کر کے بہانا دل کو بہلاتا رہا(۲۴)

باپ بیٹے کی محبت مثالی تھی، اور دنیا یاد کرے گی۔ جب کوئی اس جہاں سے چلا جاتا ہے تو اس کو ملنے کے لیے اُسی جہان میں جانا بہتر ہے۔ لیکن کبھی چاہتے ہوئے بھی نہیں مرا جا سکتا، لیکن کبھی نا چاہتے ہوئے بھی مر جاتا ہے، مرنے کا کچھ اختیار نہیں اور نہ ہی اعتبار ہے۔ اس فلسفہء موت کو مشتاق نے اس طرح بیان کیا ہے :

تری فرقت میں مجھ سے اور کچھ تو ہو نہیں سکتا
کبھی رونا ، کبھی ہنسنا ، کبھی فریاد ہوتی ہے
نہ مرنے کی اجازت ہے نہ قدموں میں بلاتے ہیں
عجب انداز سے مشتاق پر بیداد ہوتی ہے(۲۵)

محبوب کی زیارت اور صورت ہی عاشق کے لیے سرمایہ ہوتی ہے۔ جب معشوق دنیا سے چلا جائے تو عاشق کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اب مر کر ہی واصل ہو سکتا ہوں تو پھر وہ دعائیں مانگ کر واصل بہ حق ہو جاتا ہے، یہی عاشق کا وصال ہے اور یہی ملاپ ہے:

میں نے لینا ہے اور کیا تم سے
تری صورت سے پیار ہے پیارے
ترا ملنا تو اب نہیں ممکن
موت کا انتظار ہے پیارے
قبرِ مشتاق پر ذرا آؤ
بے بسی کا مزار ہے پیارے(۲۶)

تو کسی جگہ یہ کیفیت بھی ہوتی ہے:

اس کی میّت اور کاندھا ہو ترا
یہ ترے مشتاق کی قسمت کہاں(۲۷)

جب عاشق معشوق پر مر جاتا ہے تو پھر یہ بھی کہہ لیتا ہے:

نصیب اپنے جاگے تو مشتاق مر کر
وہ تربت پہ تشریف لائے ہوئے ہیں(۲۸)

مشتاق کی غزل میں رنگِ تغزل ہی ان کے فکر و فن کی جان ہے۔ وہ دھیمے لہجے اور سادہ لفظوں سے درد کے نشتر قاری کے دل پر چلاتے ہیں۔ اگرچہ یہ رنگ میر و غالب کا سا نہ سہی مگر انھوں نے اپنے عہد کی تہذیبی روایات اور اُردو غزل کی تہذیبی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نصیر گولڑوی، پیر نصیر الدّینؒ، (من آنم کہ من دانم) پیانِ شب، اسلام آباد: گیلانی پبلشرز، گولڑہ شریف، ۱۹۸۳ء، ص:۱۸

۲۔ مشتاقؔ، غلام معین الدّین گیلانی گولڑویؒ، اسرار المشتاق، اسلام آباد: مکتبہ مہریہ غوثیہ، گولڑہ شریف، ۱۹۹۹ء، ص:۶۹
۳۔ ایضاً، ص:۹۴
۴۔ ایضاً، ص:۹۵
۵۔ ایضاً، ص:۶۲
۶۔ محمد اقبال، علاّمہ، کلیات اقبال فارسی (اسرارِ خودی)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء، ص:۱۸
۷۔ مشتاقؔ، غلام معین الدّین گیلانی گولڑویؒ، اسرار المشتاق، ص:۶۹
۸۔ ایضاً، ص:۸۰
۹۔ ایضاً، ص:۸۹
۱۰۔ ایضاً، ص:۵۴
۱۱۔ ایضاً، ص:۶۶
۱۲۔ ایضاً، ص:۶۷
۱۳۔ ایضاً، ص:۵۳
۱۴۔ ایضاً، ص:۵۸
۱۵۔ ایضاً، ص:۷۳
۱۶۔ ایضاً، ص:۹۱
۱۷۔ ایضاً، ص:۵۴
۱۸۔ فیضی دکنی، ابوالفضل، کلیات فیضی، دہلی: نول کشور، ۱۹۷۰ء، ص:۲۴۰
۱۹۔ مشتاقؔ، غلام معین الدّین گیلانی گولڑویؒ، اسرار المشتاق، ص:۸۰
۲۰۔ ایضاً، ص:۸۸
۲۱۔ ایضاً، ص:۶۱
۲۲۔ ایضاً، ص:۶۰
۲۳۔ ایضاً، ص:۶۵
۲۴۔ ایضاً، ص:۶۴
۲۵۔ ایضاً، ص:۶۷
۲۶۔ ایضاً، ص:۹۹
۲۷۔ ایضاً، ص:۶۹
۲۸۔ ایضاً، ص:۷۸

☆.....☆.....☆